اسلامی تحریکات: لمحۂ فکریہ اور مراکش کا تجربہ

ڈاکٹر محمد مختار شنقیطی ○

'بروکنگز فاؤنڈیشن، امریکا کے ریسرچ اسکالر اور 'عرب بہار' کے بعد تحریکات اسلامیہ کے اُمور پر گہری نظر رکھنے والے شادی حمید، راشد الغنوشی کا قول نقل کرتے ہیں: اسلام پسندوں کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اقتدار میں آنے سے پہلے لوگ ان سے اور ان کی سوچ اور نظریہ سے محبت رکھتے ہیں اور جب وہ اقتدار میں آجاتے ہیں تو ان سے بے زار ہونے لگتے ہیں۔ تحقیق نگار نے انتخابی کارکردگی پر غور کی دعوت دی ہے:

- کیا عرب دُنیا کی ان اسلامی پارٹیوں کی ساخت میں کوئی ایسا مسئلہ موجود ہے کہ عوام میں ان کی پذیرائی گھٹ جاتی ہے؟
- یہ خود غیر مقبول ہوجاتی ہیں یا کچھ نادیدہ قوتیں انھیں غیر مقبول یا ناکام کردیتی ہیں؟
- موجودہ سیاسی نظام میں کوئی ایسی رکاوٹ ہے جو انھیں کامیاب نہیں ہونے دیتی؟
- کیا ناقص انتخابی نتائج کا مطلب ان کے سیاسی مستقبل کا خاتمہ ہے؟
- یہ حکمت عملی میں کسی اصلاح وتبدیلی کی ضرورت کی نشاندہی کا تقاضا ہے؟

یہ مضمون اسی طرح کے سنجیدہ سوالات کا جواب دیتا ہے جو یقیناً آج کی عرب بلکہ ساری مسلم دنیا کے لیے یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔

اسلامی تحریکوں کی عوامی مقبولیت میں کمی کا سبب کوئی ایک نہیں ہے۔ کہیں اس کی وجہ ماحول کا جبر ہے، اور کسی جگہ حکمت عملی اور تجزیہ ناقص ہے۔ عرب ملکوں میں مسلط استبدادی نظام اور اس نظام کی طرف سے خون خرابہ اور جان و مال کے ضیاع کے ذریعے ان تحریکوں کا استیصال

○ پروفیسر تقابل ادیان وسیاسیات، حماد بن خلیفہ یونی ورسٹی، دوہا، قطر اور موریطانیہ نژاد/ ترجمہ: حافظ محمد عبداللہ

کرنا، الیکشن میں سیکولر، فسطائی اور غیر جمہوری قوتوں کی دھاندلی، الیکشن قوانین میں رد و بدل جیسے ہتھکنڈے، نیز عالمی برادری کا اسلامی تہذیب، ثقافت اور شناخت سے دشمنی پر مبنی رویہ ہے۔

حکمت عملی اور اندرونی کمزوری کی ایک مثال تحریک کے بنیادی اور اعلان شدہ مسلّمہ اصولوں پر سمجھوتا کر لینا، اسٹیبلشمنٹ کی چالوں اور تدبیروں کے مقابل سیاسی ناپختگی، صورت حال کا صحیح ادراک نہ کرنا اور اپنی حکمت عملی کو ٹھیک سے ترتیب نہ دینا۔ پھر قیادت کا مواقع اور امکانات کو ضائع کرنا وغیرہ ہیں۔

● بات کو آگے بڑھانے سے پہلے چند اہم اور اصولی باتوں کو سمجھ لینا ضروری ہے:

○ پہلی بات یہ جان لیجیے کہ اسلام کی سیاسی تقدیر کسی تحریک اور پارٹی کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں عرب معاشروں میں اندر تک بہت گہری اتری ہوئی ہیں، اور جب تک یہ معاشرے اسلامی ہیں یا رہیں گے، اسلامی احیا کے مظاہر سامنے آتے رہیں گے۔ آج جو لوگ مبارک باد دے رہے ہیں کہ 'اسلامی تحریک احیا' کا خاتمہ ہوگیا یا عالم عرب میں 'مابعد الاسلامیہ' دور کے آغاز کی خبر سنا رہے ہیں، انھیں اس حوالے سے ہمیشہ ہی مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

○ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی احیا، اسلام کی سخت جانی اور زمانے کے غالب نظام کو اس کا چیلنج کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلامی سیاسی قوتوں کی کارکردگی بہت زیادہ متاثر کن رہی ہے، بلکہ میرے خیال میں اگر جائزہ لیں تو ان میں سے بہت سی جماعتیں سیاسی حکمت عملی، سیاسی میدان میں ناتجربہ کاری اور سیاسیات عالم سے ناواقف ہیں۔ دراصل اسلام کی یہی سخت جان فطرت تبدیلی و تحریف کے خلاف اس کی اصل قوت مزاحمت ہے۔

○ تیسری بات یہ ہے کہ دینِ حنیف اپنی فطری ساخت میں دنیا بھر کے ادیان سے مختلف واقع ہوا ہے۔ بدھ مت کے بانی بدھا اور مسیحیت کے بانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے افعال و اقوال سے دین کی تاسیس کی وہ مثال ہرگز پیش نہیں کر پائے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابدی اسلام کی مثال پیش کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ نہ تو اُس طرز کی راہبانہ تھی جیسی کہ بدھا نے گزاری بلکہ اس کے برعکس آپؐ خود بھی رہبانیت سے کنارہ کش رہے اور اسی کا درس صحابہ کرامؓ کو بھی دیا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف ضمیر کو جگانے اور متحرک رکھنے

تک ہی محدود نہ تھا، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں تھا۔ بلکہ آپؐ ایسی رسالت لائے تھے، جس میں سیاست اور فوج کشی حق و عدل اور راستی کی خدمت گار بلکہ عین نیکی اور عمل صالح کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ اسی طرح اللہ کی بندگی ہے جیسے نماز اور روزہ۔ (ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے طوفانی تھپیڑوں کے آگے کبھی نہیں جھکے تھے، جیسا کہ بہت سے ترکِ دنیا کے علَم بردار اور زاہد دُنیوی مصالح اور مشکلات کے آگے جھکتے رہے ہیں، بلکہ آپؐ نے امور دنیا کی زمامِ کار سنبھالی اور پوری قوت وشوکت سے اسے حق کی اطاعت پر لگا دیا۔ یوں ایک ایسا اخلاقی، تشریعی، سیاسی، مکمل اور کامل نظام دیا جس میں ضمیر، معاشرے اور ریاست کی سبھی قوتوں کو حق اور عدل پھیلانے کے لیے مجتمع کر دیا گیا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ اسلام تزکیہ نفس کر کے صرف ضمیر کو بیدار کرنے تک محدود رہتا ہے اور سوسائٹی اور ریاست کی مؤثر قوت کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ یہ دین فطرت ہے اور دین حقیقت وواقعیت۔ یہ جیتے جاگتے، چلتے پھرتے انسانوں کے لیے اتارا گیا ہے، فرشتوں کے لیے نہیں۔ فرشتوں کے لیے ہوتا تو انسان نہیں فرشتہ اتارا جاتا۔ قرآن کریم کا ارشاد موجود ہے: قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ (بنی اسرائیل ۱۷:۹۵) ''ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے''۔

○ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ جدوجہد سے عبارت ہے۔ آپؐ نے مادی زندگی کی چمک دمک اور حیات انسانی پر اس کے گہرے اثرات کا مقابلہ روح اور مادے، دونوں کی طاقت سے کیا تھا۔ بے لگام طاقت کو حق و عدل اور طاقت و جبروت سے زیر کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم اور فساد کو، قرآن اور تلوار دونوں کے ذریعے لگام دی تھی۔ اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاست اسلام کے رگ و پے میں شروع دن سے پیوست تھی اور ہے۔ ہجرت کے بعد ریاست کے قیام سے لے کر امراء کے تقرر تک، قاضیوں کے تعین سے لے کر فوجی مہمات بھجوانے تک، بادشاہوں کو خطوط لکھنے سے لے کر شرعی سزاؤں کے نفاذ تک، عالمی معاہدوں پر دستخط کرنے سے لے کر ملکی خزانے کو عوام کی رفاہِ عام کے لیے استعمال کرنے تک، آپؐ کی مقدس ومحترم سنتوں کی ایک لمبی فہرست ہے، جسے امور سیاست کی انجام دہی کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

آپؐ کی اس سیاست کی عملی سنت کی نہ بدھ ازم میں کوئی مثال موجود ہے اور نہ مسیحی دنیا ہی اس کی کوئی مثال پیش کرسکی ہے۔ یہ آپؐ کی طرف سے پیغام وحی کی عملی تفسیر اور تطبیق تھی۔ یہ اسوۂ حسنہ کا وہ بنیادی پہلو ہے، جس کی پیروی کا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے۔

○ ان مباحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام فقط ایک عقیدہ اور زندگی کا ایک نیا مفہوم ہی نہیں ہے اور نہ اسلام صرف روح کی بالیدگی اور اخلاقی حس کی بیداری کا نام ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک عملی سیاسی تحریک بھی ہے۔ ایک ایسا دستور سیاسی ہے، جو معاشرے کی ہمہ پہلو سبھی اجتماعیتوں کو منظم کرتا ہے۔ یہ مظلوم کی حمایت میں اور ظالم کے خلاف ایک نعرۂ بلند ہے۔ حاکم ومحکوم کے درمیان انصاف قائم کرنے والا ہے۔

لہٰذا، کسی اسلام پسند پارٹی کی انتخابات میں کامیابی، دین اسلام کی فطرت اور طبیعت کو تبدیل نہیں کرسکتی اور نہ کسی حکومت، پارٹی اور سیاسی قوت کی ناکامی، اسلام کے جامع پیغام پر شمہ برابر بھی اثرانداز ہوسکتی ہے۔

○ جب بھی نوحہ خواں، اسلامی احیا کے علَم برداروں کے سیاسی نتائج پر اکٹھے ہوکر ایک دوسرے کو مبارکبادیں پیش کرتے ہیں کہ ''اسلام کے سیاسی غلبہ اور اجتماعی امور میں کارفرمائی کا دور لَد گیا'' تو دوسری طرف راکھ میں دفن شرارے سے روشنی لے کر یہ ازسرنو اور ایک نئی قوت کے ساتھ اٹھتا ہے۔

آج جو لوگ تاریخ کے نئے مرحلے مابعد اسلامی احیائی دور (Post Islamism) کی نوید سنا رہے ہیں اور مبارک باد دے لے رہے ہیں، میں ان سے کہوں گا کہ ان کی خوشی قبل از وقت ہے۔ ہوسکتا ہے انھیں ماضی کی طرح پھر گہرا صدمہ جھیلنا پڑے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر موجودہ اسلامی تحریکیں کسی وجہ سے مطلوبہ تبدیلی نہ لاسکیں تو بھی کچھ اور نئی قوتیں ان کی جگہ ضرور لیں گی، اس لیے کہ جسے 'سیاسی اسلام' کہا جارہا ہے وہ دراصل امت کے شعور اور وجدان کی تعبیر ہے۔ یہ اُس تعلق کا ایک اظہار ہے جو دین اسلام کا ملت اسلامیہ کے ساتھ ہے، اور جس سے مسلمان جذبۂ عمل حاصل کرتے ہیں۔

ان اصولی باتوں کے بعد اسلام پسند پارٹیوں کی بظاہر کم ہوتی مقبولیت پر کچھ کلام کرتے ہیں۔

'عرب بہار' اسلام پسندوں کے لیے قبل از وقت اور بہت اچانک تھی۔ جب یہ بہار آئی تو اسلام پسندوں کے لیے انتظام مملکت سنبھالنا ابھی قبل از وقت اور نہایت غیر موزوں تھا۔ اس وقت اقتدار میں آنے کا ان کا نہ کوئی ارادہ تھا اور نہ امور جہانبانی سنبھالنے اور حکمرانی کرنے کی ان کی کوئی تیاری تھی بلکہ یہ عوام الناس کی خواہش تھی، جو استبدادی اور بدترین ظالمانہ اور کرپٹ حکومتوں کی سختیاں جھیل جھیل کر تنگ آچکے تھے۔ انھی عوام نے اسلام پسندوں کو سیاست میں رہنما کردار ادا کرنے پر مجبور کیا۔

اگرچہ 'عرب بہار' سے پہلے بھی چند ممالک میں اسلام پسندوں کو شراکتِ اقتدار کا تجربہ ہوا تھا، یعنی یمن اور اردن وغیرہ میں۔ تاہم، ایک ایسے وقت میں جب عرب دنیا میں انقلاب اور مخالف انقلاب کی کش مکش ابھی عروج پر تھی اور دوسری طرف تنگ آئے ہوئے عوام کی توقعات آسمان کو چھو رہی تھیں اور خدشات خطرناک ترین سطح پر تھے۔ ان حالات میں اسلامی قوتوں کے لیے بہتر طرزِعمل یہ تھا کہ اس معاملے کو زیادہ تدبر اور صبر کے ساتھ دیکھتے اور بے خطر اس میں کود نہ پڑتے۔ اسلام پسندوں کو ملنے والے اقتدار کو شادی حمید نے اپنی کتاب میں 'یرغمالی اقتدار' سے تعبیر کیا ہے۔

دراصل 'عرب بہار' کے بعد اسلام پسندوں کو ملنے والا اقتدار حقیقی تھا ہی نہیں۔ انقلاب کے بعد پہلے آزادانہ انتخابات میں منتخب ہونے والے مصری صدر مرسی شہید، ریاست مصر میں ہرگز فیصلہ کن اختیار واقتدار کے مالک نہیں تھے بلکہ فیصلہ سازی کا اصل اختیار برسوں سے مسلط فوجی جنتا کے ہاتھ میں تھا یا مقتدر سیکولر اشرافیہ اور ان دونوں کی پشتی بان عالمی مقتدرہ کے ہاتھوں میں یرغمال تھا۔

اسی طرح اسلام پسندوں کے وزیراعظم ہوں یا پارلیمان کے اسپیکرز کسی کے پاس بھی حقیقی اختیار و اقتدار نہیں تھا اور نہ انھیں دستور کی دی ہوئی طاقت کو، جو انتخابات میں کامیابی کے بعد ان کا استحقاق تھی، استعمال کرنے پر کبھی قادر رہنے دیا گیا۔

دوسری جانب مراکش میں بھی وزیراعظم تو اسلامی احیا پسندوں کا تھا، لیکن فیصلہ کن طاقت اور اصل اختیار و اقتدار، مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں رہا۔ پھر تیونس میں سیکولر قوتوں کی ہٹ دھرمی اور اپنی انتخابی شکست کو تسلیم نہ کرنا اور ہارنے کے بعد تیونس کو انتقاماً اہل تیونس ہی پر ڈھا دینے کی ان کی کوششوں نے النہضۃ کے قائدین کو کبھی سُکھ کا سانس نہیں لینے دیا۔ انھیں مجبور کیا گیا کہ پارٹی کی انتخابی کامیابی اور انقلاب کے ثمرات میں سے کسی ایک کو چنیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اسلام پسند کہیں خود بھی صرف نمایشی اختیار و اقتدار پر قانع ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر عوامی توقعات کا بوجھ تو پڑ گیا، لیکن تبدیلی کا حقیقی اختیار ان کے پاس تھا ہی نہیں کہ کچھ کر پاتے۔ مصر، تیونس، مراکش ہر جگہ کم و بیش ایک سی صورت حال تھی۔ بعد ازاں واضح بھی ہو گیا کہ یہ حکمت عملی کی فاش غلطی تھی، جس کی بڑی قیمت چکانا پڑی۔ نہ تو انھوں نے دستور میں لکھے اور قوم کے دیئے ہوئے انتخابی مینڈیٹ اور اختیارات کو اسٹیبلشمنٹ سے زبردستی چھین کر لیا اور نہ ایسے نمایشی اختیار و اقتدار کو ٹھوکر ماری اور استعفا دے کر قوم سے دوبارہ رجوع کیا کہ ان کی اخلاقی برتری قائم رہتی اور حقیقی اختیار سے خالی ان منصبوں کا بوجھ نہ اٹھانا پڑتا۔ ان پر مشہور تابعی امام عامر الشعبی رحمۃ اللہ کی وہ بات صادق آتی ہے، جو انھوں نے حجاج بن یوسف کے پھیلائے ہوئے فتنے کے دور میں کہی تھی: تلك فتنة لم نكن فيها بررة أتقياء، ولا فجرة أقوياء ''ایسا فتنہ تھا جس میں نہ تو ہم مخلص فرماں بردار تھے اور نہ طاقتور باغی و سرکش''۔

اگر اسلام پسند سیاست کرنے والوں کے پاس چھٹی حس ہوتی اور ان کی سیاسی تدبیروں میں لچک رہتی، تو وہ قوم کے دیئے ہوئے مینڈیٹ اور اختیار کو غاصبوں سے چھین لیتے ورنہ جونہی انھیں احساس ہو گیا تھا کہ یہ نمایشی اور یرغمالی اقتدار ان پر ایک اخلاقی بوجھ ہے تو ایسے لاحاصل اقتدار کو چھوڑ دیتے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ کچھ اسلامی تحریکوں خصوصاً مراکش کی حزب العدالة والتنمية نے صاف ستھری سیاست اور کارکردگی دکھانے کی پالیسی کو ترجیح دی، نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں سے ہی ہاتھ دھونا پڑے۔ اسلامی تحریک کے لیے معاشرے میں کچھ جاذبیت اگر ہے تو اس کی اصول پسندی، معاشرے کے معروف اخلاقی قاعدوں پر چلنے، اپنی اسلامی شناخت پر اصرار، اسلامی اصولوں کے پرچار اور اندرونی استبداد اور بیرونی غلامی کے مقابل اس کی اخلاقی برتری کی وجہ سے ہے۔

بعض تحریکوں کو یہ خوف لاحق رہا کہ سیاسی سطح پر جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، اسے برقرار رکھ پائیں گے یا نہیں؟ وہ سیاسی کامیابی کی بقاء کے لالچ میں پڑ گئے اور تحریک اسلامی کے بنیادی اصولوں اور موقف کو ہاتھ سے جانے دیا۔ ان کا نقطۂ نظر تھا کہ ہماری معاشی اور اجتماعی کارکردگی ہماری اصول پرستی چھوڑ بیٹھنے کو سہارا دے لے گی۔ وہ یہ بھول گئے کہ ان کے پاس معاشی اور اجتماعی سطح پر کارکردگی دکھا پانے کی صلاحیت موجود ہی نہیں۔ اس طرح وہ ایک ساتھ دونوں محاذوں پر

شکست کھا گئے۔ اخلاقی برتری بھی گئی اور کارکردگی بھی صفر رہی۔ پھر مراکش کی حزب العدالۃ والتنمیۃ ایسے سیاسی معاملات میں اُلجھی جو اس کے دائرے سے باہر تھے، جیسے اسرائیل کو تسلیم کرنا، فرانسیسی کو ذریعۂ تعلیم بنانا، اور بھنگ کی کاشت وغیرہ۔ ان معاملات کی بڑی سیاسی قیمت چکانا پڑی۔

عبدالالہ بن کیران (حزب العدالۃ والتنمیۃ کی پہلی حکومت میں وزیراعظم اور اس وقت پارٹی کے سیکرٹری جنرل) بادشاہ کے اقتدار اور اثر ونفوذ اور منتخب حکومت کے اقتدار و اختیار کے درمیان توازن رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ مگر ان کے بعد آنے والے مراکش کے وزیراعظم (پارٹی کے دوسرے سیکرٹری جنرل) سعدالدین عثمانی کامیاب نہیں ہو پائے۔ یہی وجہ تھی کہ بن کیران کی عوامی پذیرائی اور سیاسی تدبیروں نے، عوامی لب ولہجہ میں ان کی جملہ بازی نے پارٹی کو بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ اسی طرح ان کا دیگر، خصوصاً کرپٹ سیاسی رہنماؤں پر مسلسل دباؤ، جنھیں وہ مگرمچھوں سے تعبیر کرتے تھے اور ضمناً بادشاہ پر بھی کبھی کبھار کی تنقید نے بن کیران کی رہنمائی میں مراکش کے اسلام پسندوں کی حفاظت کی اور عوام کے ذہنوں میں اس تصور کو راسخ کیا کہ اسٹیبلشمنٹ کی غلطیوں میں اسلامی احیا کے علَم برداروں کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔

مراد یہ ہے کہ پارٹی کی قسمت پر لیڈرشپ کا تسلسل کتنا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اگر کرشماتی اور مضبوط قیادت ہو تو وہ پہلے سے موجود سیاسی قیادت اور نئی آنے والی سیاسی قیادت کے درمیان توازن پیدا کر لیتی ہے۔ اور اگر قیادت کمزور ہو تو وہ پہلے کے اثرات کو بھی نقصان پہنچا دیتی ہے۔

مراکش کی حزب العدالۃ والتنمیۃ نے جب بن کیران کی کرشماتی قیادت کو کھو دیا (بعض حلقوں کے نزدیک بادشاہ ان کی عوامی مقبولیت سے خائف تھا اور اسی کے دباؤ پر پارٹی نے سعدالدین عثمانی کو وزیراعظم کے عہدے کے لیے نامزد کیا تھا) اور ان کی جگہ ایک اکیڈمک پروفیسر بیوروکریٹک رویے کے حامل، کمزور، سیاسی وژن سے عاری اور پرانے سیاسی گروووں کے خلاف مضبوط سیاسی اقدامات کی جرأت سے خالی فرد کی نامزدگی تھی، جس کی سیاست کا انحصار معاشرے کے عوام کی دل جوئی کے بجائے اسٹیبلشمنٹ کی رضاجوئی اور بادشاہ کی فرماں برداری پر تھا۔ جب انھیں آگے لایا گیا تو توازنِ سیاست بگڑ گیا جس کا خمیازہ پارٹی کو اقتدار کے بعد شکست کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

اس طرح مراکشی تجربہ حزب العدالۃ والتنمیۃ کو اپنے ڈھب پہ لانا اور اسٹیبلشمنٹ کی

طرف سے گھیرا تنگ کرنا اور بالآخر پارٹی کو گہری دلدل میں پھنسا دینے کا منصوبہ مکمل ہوگیا۔ بالکل اُسی انداز میں کہ جس طرح ماضی میں مراکش کی کئی سیاسی قوتیں بے دست و پا بنائی جا چکی تھیں: حزبِ استقلال اور اشتراکی اتحاد وغیرہ۔

تحریک اسلامی مراکش کا وہ فخر بھی اسے کچھ فائدہ نہ دے سکا اور نہ وہ لمبے چوڑے دعوے کہ ہم اخوان المسلمون سے زیادہ سیاسی شعور کے مالک اور میدانِ سیاست کے پختہ کار کھلاڑی ہیں۔ یہ تفاخر دراصل ایک اور قسم کی غلطی کا ارتکاب تھا۔

'زیادہ سے زیادہ کی حکمت عملی' جس پر مصر میں اخوان المسلمون کاربند ہوئی اور صدارتی الیکشن میں قبل از وقت شرکت کی، یہی پالیسی انھیں استبداد کے عادی ظالم مصری نظام کی دیوار سے سر پھوڑنے کی طرف لے گئی۔ مگر مراکش میں 'کم سے کم کی حکمت عملی' اختیار کی گئی، جو تحریک اسلامی کو مکمل طور پر اسٹیبلشمنٹ کے ڈھب پر ڈھالنے اور انھیں اپنے اخلاقی پیغام سے محروم کرنے پر منتج ہوئی کہ جس پیغام میں عوام کے لیے اصل جاذبیت تھی۔ انھیں طاقت سے دُور اور کسی عملی کارنامے سے محروم رکھا گیا کہ جو اخلاقی برتری سے محرومی کا عوضانہ بن جاتا ہے۔ ۹۰ کی دہائی میں یہی طریقہ الجزائر کے انقلابی فوجیوں نے اخوان کے ساتھ روا رکھا تھا، پھر اسے موریتانیہ، مراکش، تیونس اور لیبیا میں دہرایا اور آزمایا جاتا رہا۔

تاہم، اقتدار میں آنے کے بعد اسلامی قوتوں کی اس کمزوری اور کوتاہی کے برعکس عالمِ عرب کی سیکولر قوتوں کی حالت زار اسلام پسندوں سے کہیں زیادہ گئی گزری ہے۔ سیکولرسٹوں کے لیے کئی مسلم ملکوں کے اقتدار کا دروازہ مدتوں کھلا رہا ہے، لیکن یہ قوتیں اپنی قوم کو ترقی دینے کے میدان میں مکمل طور پر ناکام ہوئیں۔ دراصل آزادی کا معرکہ اور اپنی شناخت کا معرکہ ان سیکولرسٹوں کی ترجیح اور ان کے ایجنڈے کا حصّہ تھا ہی نہیں۔

معرکۂ حریت و آزادی اور اسلامی شناخت قائم رکھنے کے معرکہ میں اسلامی تحریکات کو بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ معاشرے کی اسلامی شناخت برقرار رکھنے کے اس معرکے میں یہ اسلامی تحریکیں ایک فوجی قلعہ کی مانند مضبوط ثابت ہوئیں۔

اسی طرح عوامی انقلاب، 'عرب بہار' کو کامیاب بنانے میں بھی اصل کردار انھی اسلامی

تحریکات کا تھا۔ اسی لیے علاقائی اور عالمی طاقتوں کی استحصالی چکّی میں بھی یہی قوتیں پس رہی ہیں۔ اس لیے کہ لوگ انھی سے توقع باندھے ہوئے ہیں، سیکولر قوتوں سے نہیں۔ تاہم، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تحریکات اسلامیہ جب بھی اقتدار میں آئیں یا شریکِ اقتدار ہوئیں، ترقی کی دوڑ میں وہ بھی ابھی تک کوئی خاص کارنامہ اپنے دامن میں سمیٹ نہیں پائیں۔

شاید سب سے بڑا خطرہ اس وقت جو ان تحریکات کو درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے عزائم اور ارادے بہت قلیل ہیں۔ یہ تھوڑے پر قناعت کرجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض میدانِ عمل میں اپنی موجودگی ہی کو اور زندگی ہی کو کامیابی کی دلیل شمار کرنے لگتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ان کا سیاسی اور تہذیبی تبدیلی کا پروگرام اسی حد تک تھا، جو کامیاب ہو چکا ہے۔ بعض تحریکات بلاوجہ اور بے فائدہ اپنے اسلامی رنگ ڈھنگ اور اسلوب و انداز، حتیٰ کہ طریق کار تک سے علیحدگی اختیار کرلیتی ہیں اور یوں ایک ایسے معاشرے میں اپنا اخلاقی جواز ہی گم کر بیٹھتی ہیں، جہاں سارے ہی، ریاکاری پر مبنی کھوکھلے نعروں سے اپنے وجود کا جواز حاصل کرتے ہیں۔

دوسرے ان میں سیاسی ناپختگی بھی موجود ہے۔ اس کمزوری کا مطلب انفعال و ارتجال اور محض ردِعمل کی سیاست ہے۔ یہ ساری زندگی ایک دائرے میں گھرے اتار چڑھاؤ کے درمیان جینے کے سفر جیسا ہے، جہاں کچھ بن نہ پا رہا ہو، نہ کوئی قابل ذکر کامیابی ہی مل رہی ہو۔

اصلاح و تجدید کی تحریکوں کے لیے وقتاً فوقتاً مصلح اور مجدد کی ضرورت رہتی ہے، جو ان کی رہنمائی کرے اور ان میں کارِتجدید انجام دیتا رہے۔ اور آج تحریکات اسلامیہ کو تبدیلی و تجدید کی شدید ضرورت ہے تاکہ ان میں سیاسی پختہ کاری کی داغ بیل پڑے اور یہ زیادہ واقف اور باشعور ہوں، میدانِ سیاست سے بھی اور دنیا کی سیاست سے بھی۔

یہ دلیل کافی نہیں ہے، جو بعض اسلام پسند آج دے رہے ہیں کہ تحریکات اسلامیہ خود ناکام نہیں ہوئیں بلکہ ان کے داخلی اور خارجی دشمنوں نے انھیں ناکام بنایا ہے۔ یہ دلیل دیتے ہوئے ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ آسانی سے ناکام ہوجانا تو خود اپنی جگہ ناکامی ہے اور محاصرے میں گھر جانا خود ایک بڑی کمزوری ہے۔ سیاست تو کامیابی اور قوت کے حصول کے لیے مسلسل کش مکش کا نام ہے، سیاست صرف تقریروں اور اچھی نیتوں کا نام نہیں ہے!